ڈاکٹر عاصمہ رانی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، دگورنمنٹ صادق کالج ویمن یونی ورسٹی، بہاول پور
ڈاکٹر اقصیٰ نسیم سندھو
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونی ورسٹی، بہاول پور

”آخر شب کے ہم سفر“ قرۃ العین حیدر کا ایک منفرد اور مکمل ناول

Dr. Asma Rani
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. Sadiq College Women University, Bahawalpur.
Dr. Aqsa Naseem Sindhu
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. Sadiq College Women University, Bahawalpur.

Akhir-e-Shab Key Humsafar ,A Unique and complete Novel by Qurrat-ul-Ain Haider

Qurrat-ul-Ain Haider is one of the most outstanding, influential literary Urdu fiction writers. She is known for her novels, short stories, and academic writings. She was something unique that happened to urdu literature.Her literary works include twelve novels and novellas and four collection of short stories.The fourth novel in Qurrat-ul-Ain Haider's literary work was Akhir-e-Shab Ke Humsafar (A novel on the Naxalite Movement and Bengal unrest) was published in 1979. In the novel with utmost ease she narrated the harsh realities of life. A complete summary of the novel by the author will be presented in this article. The article would illustrate how, with confidence, she successfully explained to her readers the complicated issues of politics, history, economics, and culture.

Key Words: *Qurrat-ul-Ain Haider's, Novel, Communism, Revolution, Independence.*

قرۃ العین حیدر کو اُردو فکشن کے معماروں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے ان کے افسانے اور ناول صرف داستاں طرازی نہیں بلکہ ان کے ناولوں میں کئی جہان اپنی پوری تاب و توانائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ وہ اُردو کی پہلی ناول نگار ہیں جو اپنے ناولوں کی صورت حال میں پہلے خود ایک زندگی گزار لیتی ہیں، اس کے بعد اسے

لفظوں میں ڈھالتی ہیں۔ ہر واقعے اور ہر کردار پر ان کی عینی شہادت کی مہر ثبت ہوتی ہے۔ معاشرے پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ خود بے سادہ شخصیت کی حامل ہیں۔ شخصیت کی تعمیر میں خاندانی عظمت اور علمی ماحول کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ قراۃ العین حیدر کے والد سے سجاد حیدر یلدرم کا ادبی دنیا میں ایک مقام ہے۔ قراۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد حیدر بھی اہل قلم میں ایک نام رکھتی ہیں۔ اُردو ادب ان کے ورثہ میں ہے۔

تقسیم ہند کے بعد قراۃ العین حیدر کچھ عرصہ پاکستان میں سکونت پذیر رہیں۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان کی وزارت اطلاعات ونشریات میں انفارمیشن آفسر مقرر ہوئیں اور لندن میں پاکستان ہائی کمیشن میں پریس اتاشی کی حیثت سے بھی تعینات رہیں۔ کچھ دنوں تک انہوں نے پاکستان انٹر نیشنل ایر لائنز میں بھی کام کیا۔ اسی اثنا میں ان کا شہرت یافتہ ناول آگ کا دریا ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ قراۃ العین حیدر کے لیے مخالفت کے یہ شعلے ناگوار خاطر ہوئے اور وہ ۱۹۶۴ء کے قریب پاکستان سے مستقل طور پر بھارت چلی گئیں۔ ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے مختصراً جو بیان کیا گیا اس سے ان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک فنکار کا فن اسکی شخصیت کا نغمہ بے آواز ہوتا ہے۔ قراۃ العین حیدر کی تخلیقی جودت نے اُردو ادب میں جو کارنامہ سر انجام دیا ہے وہ اگر آفتاب نہیں تو ایک درخشاں مہتاب کا درجہ انہیں ضرور بخشتا ہے۔ وہ اس حقیقت پر اصرار کرتی ہیں کہ قوموں کی تہذیبی تشخص ان کی تاریخ میں اور افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے ناولوں میں ماضی وحال دونوں کا تجربہ ایک ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے ہاں وقت ایک اکائی ہے اور وہ حال کو ماضی کے اثرات اور عوامل سے الگ نہیں کرتیں۔ ان کے اکثر ناولوں میں ماضی کا سفر حال کو روشن تر بناتا ہے۔ قراۃ العین کے فن کی انفرادیت کا امتیازی پہلو جو قارئین کو متاثر کرتا ہے۔ ان کا خوبصورت رواں دواں اور شائشتہ نثری اسلوب ہے جس میں چستی ہی نہیں تہ داری اور تنوع بھی ہے۔ قراۃ العین کی یکتا روز گار شخصیت اور بے مثال ادبی صلاحیت صرف عطیہ فطرت نہیں ہے۔ اس کے پیچھے ان کی برسوں کی محنت، ریاضت، تلاش و تحقیق اور تفکر رہا ہے۔ قراۃ العین کے فن کو تاریخ سے مناسبت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ ہی کو افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ادبی صورت حال پر بھی انکی نظر ہمشہ سے بہت گہری رہی ہے آگ کا دریا ان کے ادبی سفر کا وہ سنگ میل ہے جہاں سے نہ صرف قراۃ العین کے فنی و فکری نہج کی ایک بلند صورت سامنے آئی بلکہ ادب کے وسیع تر مناظر نامے پر بھی کچھ نئے امکانات کی راہیں کھلتی نظر آئیں۔ قراۃ العین کے فن کا آغاز تو اک رومانی فضا میں گم ایک بڑے لطیف اور خوابوں سے سجے شاداب ماحول میں ہوا لیکن یہ بھی درست ہے کہ وہ خوابناک احساس کی دلکش دنیا میں ہی قید ہو کر نہیں رہ گئیں۔ وہ بڑی تیزی سے فضاء سے نکل کر ایسے مرحلے میں داخل ہو جاتی

ہیں جہاں عہد نو کی پیچیدہ زندگی کے سیاق وسباق میں جلا وطنی اور ہجرتوں کے احوال، رشتوں کے انہدام اور اس کے بعد نئے سرے سے ان کے جڑنے کے درمیان پیدا ہونے والے نفسی مسائل کی تفہیم کے لیے ایسے وژن کی متلاشی نظر آتی ہیں کہ جو انہیں عرفان ذات کی سرحد تک پہنچا دے۔ ان کا پورا فن ایک سفر کی طرح ایک تسلسل کے ساتھ اسی سیاق وسباق میں آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔

قراۃ العین کا ناول آخر شب کے ہمسفر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے میرے بھی صنم خانے، سیفنہ غمِ دل اور آگ کا دریا سامنے آچکے تھے جو قراۃ العین کو اُردو کی ایک ایسی ناول نگار کے طور پر سامنے لا چکے تھے جسے برصغیر کی مختلف تہذیبوں، معاشروں اور طبقوں سے خصوصی دلچسپی ہے اور جو انگریزی زبان و ادب کی ایک طالب علم ہونے کی وجہ سے ناول میں مغربی تکنیکیں استعمال کرنے کے گر سے بخوبی واقف ہے۔ آخر شب کے ہمسفر کا عنوان فیض کے مشہور مصرعے "آخر شب کے ہمسفر فیض نہ جانے کیا ہوئے" سے ماخوذ ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے نقادوں میں اختلاف رائے، پایا جاتا ہے۔

> "قراۃ العین حیدر کا ناول آخر شب کے ہم سفر اسی لحاظ سے ایک اہم ناول ہے کہ اس میں ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک ہونے والی باغی نسل کے ESTABLISHMENT میں شامل ہونے اور اس سے اگلی نسل کے بنگلہ دیش کی آزدی کی تحریک میں حصہ لینے کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔"(۱)

ڈاکٹر سلطانہ بخش کے نزدیک:

> "اس ناول میں انھوں نے بنگال کی انقلابی تحریکوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس میں تہذیبی طبقوں کے مطالعوں کا ایک نیا باب سامنے آتا ہے۔ اگرچہ یہ ناول ان کے دوسرے ناولوں سے مختلف ہے لیکن اس میں بھی تاریخ اور وقت کی جبریت کا احساس ہوتا ہے۔ اس ناول کا ہر کردار منفرد اور مکمل داستان نظر آتا ہے۔ ان کا یہ ناول بنگال کے مخصوص سیاسی اور تہذیبی پس منظر پیش کیا گیا ہے۔"(۲)

اس ناول کے حوالے سے نیلم فرازنہ لکھتی ہیں:

> "سر زمین بنگال کی دیومالائی فضا میں پروان چڑھنے والی بائیں بازو کی دہشت پسند تحریک اور اس کا المیاتی انجام اس ناول کا موضوع ہے۔ یہ تحریک انگریزی سامراج کے خلاف ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک سر گرم تھی۔"(۳)

اس نقطہ نظر سے جائزہ لیں تو یہ تحریک اس کا ایک اہم موضوع ضرور ہے مگر اس تحریک کا وجود ناول میں قیام پاکستان تک کے واقعات میں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد یہ کہیں نظر نہیں آتی۔ بعض نقادوں نے کہا اس میں بھی آگ کا دریا کی طرح مصنفہ نے مختلف تہذیبوں کی آمیزش کو پیش کیا ہے۔ یہ بات اپنے طور پر درست ہے کہ ہندوستان کی مختلف تہذیبوں کا مطالعہ قراۃ العین کا پسندیدہ موضوع ضرور ہے جو اس ناول میں نظر آتا ہے مگر یہ بھی اس ناول کا بنیادی موضوع نہیں۔ اس ناول کے بارے میں ایک نقطہ نگاہ یہ بھی ہے کہ اس میں انقلابی آدرشوں کے انحاط وزوال کو پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ممتاز علی خان اس نظریے کے قائل ہیں وہ لکھتے ہیں۔

> "یہ ناول تھیم کے اعتبار سے انقلابی آدرشوں کے زوال کو ظاہر کرتا ہے۔" (۴)

جب ہم اس نقطہ نگاہ کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت کے قریب ترین دکھائی دیتا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار ریحان الدین احمد، دیپالی سرکار اور رازی بیز جی، ناول کے آغاز میں اپنے انقلابی آدرشوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور بائیں بازو کی دہشت گرد تنظیم میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے قائل نظر آتے ہیں مگر وقت کے ساتھ ان کے یہ عزائم تبدیل ہو جاتے ہیں اور وہ معاشی حالات کے جبر کے نتیجے میں اپنے انقلابی نظریات کو ترک کر دیتے ہیں۔ یوں وقت کی رفتار اور اس کے تقاضوں کو پہچان کر اس سے مصلحت اور سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح انقلابی نظریات کا زوال اور حالات سے سمجھوتہ اس ناول کا بنیادی موضوع بن جاتا ہے۔

جیسا کے آغاز میں بیان ہوا مصنفہ کے ناولوں میں تکنیک کے حوالے سے مغربی اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ ناول نگاری میں خود کلامی، ڈائری اور خط کی تکنیک کو بھی قراۃ العین نے کامیابی سے برتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کتنا بھی مضبوط کیوں نہ ہو وہ وقت کے دھارے کے سامنے کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ان کے ناولوں میں سب سے زیادہ مضبوط اور توانا کردار "وقت" ہے۔ ان کے ناولوں میں عموما پلاٹ یکساں نوعیت کے حامل ہیں۔ جن میں خیالات بکھرے ہوئے اور بے ترتیب دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں ایسے ڈرامائی مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں جو پلاٹ میں تجسس اور سسپنس پیدا کر کے ناول کے پلاٹ میں دلچسپی پیدا کریں۔ مگر اس ناول آخری شب کے ہمسفر میں

ایسے متعدد ڈرمائی لمحات دکھائی دیتے ہیں۔ جو اس کے پلاٹ میں دلچسپی اور سسپنس پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس ناول میں مصنفہ کی مختلف تکنیکوں کے استعمال نے کہیں کہیں سست روی بھی پیدا کر دی ہے اور بعض مقامات پر غیر ضروری جزئیات نگاری سے پلاٹ کی چستی کو نقصان پہنچا ہے۔ اس ناول میں کرداروں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ ان میں ریحان اور دیپالی سرکار کے کردار کافی اہم ہیں جبکہ اومارائے، روزی، جہاں آرا، یاسمین اور ناصرہ نجم السحر کے کردار اہم ہونے کے باوجود ثانوی نوعیت کے حامل ہیں۔ ناول کا ہیرو ریحان الدین احمد ہے۔ جو ناول کے آغاز میں بنگال میں چلنے والی بائیں بازو کی تحریک کے رہنما کے حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ تحریک کے کارکنوں کا آئیڈیل ہے۔ ذہین ہے اور اپنے آدرشوں کے ساتھ اتنا کمیٹڈ ہے کہ وہ ان کی خاطر کچھ کر بھی گزرنے پر تیار نظر آتا ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش ہے خاص کر جنس مخالف کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ تین لڑکیاں جہاں آرا، اومارائے اور دیپالی سرکار اس کی محبت کے سحر میں گرفتار ہیں۔ جہاں آراء، اس کی منگیتر اور نواب قمر الزماں جو کہ ریحان کے ماموں ہیں، ان کی بیٹی ہے مگر وہ اپنے آدرش کے خاطر اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ دیپالی سرکار کے ساتھ ساتھ اس کی دوستی اومارائے سے بھی ہے۔ فکری اعتبار سے اوما پکی کمیونسٹ ہے۔ فکری و نظری اعتبار سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں مگر جب اوما کو پتا چلتا ہے کہ ریحان دیپالی سرکار سے محبت کرتا ہے تو وہ سازشوں کا جال بچھا کر ان دونوں کو جدا کر دیتی ہے۔ یہ جدائی ریحان کے لیے کسی المیے سے کم نہیں۔ اس کے بعد اس کے کردار کی معصومیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی آئیڈیالوجی دم توڑ دیتی ہے۔ وہ وقت سے سمجھوتہ کر لیتا ہے اور اس زندگی کے دامن میں پناہ لیتا ہے جس کے خلاف اس نے طویل جنگ کی تھی۔ وہ کلکتہ آجاتا ہے اور کانگریس میں شامل ہو جاتا اور وزارت حاصل کر لیتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں وہ بنگلہ دیش جا کر مکتی باہنی کے ہاتھوں قتل ہونے والے اپنے ماموں نواب قمر الزماں کا اکلوتا وارث ہونے کے سبب ساری جائیداد پر قبضہ کر خود نواب بن جاتا ہے۔ یوں بورژوائی طبقے کے خلاف لڑنے والا یہ کردار خود اسی طبقہ کا حصہ بن جاتا ہے۔ ریحان الدین کا کردار مثالی نہیں بلکہ حقیقی اور زندہ کردار ہے۔ اس میں خوبیاں اور خامیاں دونوں موجود ہیں۔ وہ متحرک اور ارتقائی کردار ہے جو وقت کے تقاضوں کے مطابق خود کو تبدیل کر لیتا ہے۔ ناول کا دوسرا مرکزی کردار پیالی سرکار ہے۔ یہ بلاشبہ اس ناول کی ہیروئین ہے۔ بنگال کے سفید پوش ڈاکٹر کی بیٹی ہے اور انقلابی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ نو عمری سے ہی اس تحریک سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ یہاں ریحان سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ پارٹی کے اصولوں کی طرح اس کو بھی اپنا آئیڈیل بنا لیتی ہے۔ ذہین اور بہادر ہے۔ کچھ بھی کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ ناول میں جگہ جگہ اس کی بہادری اور پارٹی سے اس کی شدید ذہنی وابستگی ظاہر ہوتی

ہے۔ اوما کی سازش سے وہ ریحان سے بدگمان ہو جاتی ہے۔ یوں یہ جذباتی ناکامی اس کو بکھیر کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے سارے خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ سب کچھ چھوڑ دیتی ہے قیام پاکستان کے بعد کلکتہ چلی جاتی ہے کچھ عرصے بعد باہر چلی جاتی ہے۔ وہیں شادی کر کے باقی زندگی ٹھاٹھ سے گزارتی ہے۔ دیپالی بھی ریحان کی طرح حقیقی اور ارتقائی کردار ہے جو بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ اومارائے بھی اس تحریک سے وابستہ ہے مگر اس میں کمنٹ منٹ نہیں جو دیپالی اور ریحان میں ہے قراۃ العین نے اس کا تعارف یوں کروایا ہے۔

> "اوما کی شکل بہت معمولی تھی۔ باپ کی دولت و ثروت کی وجہ سے اچھے رشتے آسکتے تھے لیکن وہ سیاست کے چکر میں مبتلا تھی۔ اوما دیوی ایک گول مٹول چہرے والی ایک گدبدی سی لڑکی تھی۔ خلیق اور متواضع، گمبھیر اور تزئین لیکن اسے غصہ بہت جلد آجاتا تھا اور ماں باپ سمیت کوئی بھی اس کی خلاف مرضی کوئی بات اس سے کہتا تو وہ فوراً آگ بگولہ ہو جاتی تھی۔"(۵)

اس کی دلچسپی ریحان سے ہے۔ وہ اپنی رقابت سے دیپالی اور ریحان کو تو الگ کر دیتی ہے مگر وہ خود بھی اس کو پانے میں ناکام رہتی ہے۔ اس میں ذہانت اور عیاری ہے مگر نسوانیت بہت کم ہے۔ ساری زندگی لامذہب رہنے کے بعد آخر میں مذہب میں پناہ لے لیتی ہے۔ یہ بھی حقیقی کردار ہے۔ مجموعی اعتبار سے جب ہم اس ناول کے کرداروں کو دیکھتے ہیں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ناول نگار نے اپنے کرداروں پر بہت محنت کی ہے۔ ان میں بہت حد تک حقیقت پائی جاتی ہے۔ موضوع، پلاٹ اور کردار نگاری کے بعد اس کے مکالمے بھی بے حد جاندار ہیں۔ ناول کے مکالموں میں کردار کی پوری شخصیت جھلکتی ہے۔ ان مکالموں میں الفاظ محض اظہار کا وسیلہ نہیں ہوتے بلکہ اپنے ماحول اور کلچر اور کردار کی ذہنی سطح کے اظہار کا وسیلہ اور نمائندہ بن جاتے ہیں مثلاً قمر الزماں کی ملازمہ مالا سرہا کا ایک مکالمہ دیکھیے۔ جہاں آراء وغیرہ کی بارات پر جانے کی تیاری کے سلسلے میں وہ انہیں اٹھنے کو کہہ رہی ہے۔ ان مکالموں میں سرہا کی شخصیت، ذہنی اور قصباتی لہجہ سب کچھ نمایاں ہے۔

> "بی بی مالا سرہا، انے ریشمی جھالر دار لیمپ کا سوئچ دبا کر اطمینان سے کھیس نکالتے ہوئے جواب دیا۔ اجی! وہی سب کچھ سگن بگیچے والے، ڈوئی ٹھو موٹر بھر کر، دنیاج پورے چلے خاطر، اٹھیے! سب جنے تیار ہیں، جہاج ٹھیک ساتھ بجے چھوٹے گا۔ آپ ابھی تلک سو رہی ہیں۔"(٦)

قراۃ العین کے اسلوب کے حوالے سے دیکھیں تو ان کی زبان ترسیلی بھی ہے اور تخلیقی بھی۔ دونوں قسم کی نثر دکھائی دیتی ہے۔ اس ناول کی نثر میں جہاں تخلیقی اندراز نمایاں ملتا ہے وہاں فکر کی آمیزش بھی دکھائی دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اسلوب میں ایک پختگی ملتی ہے جس میں تخلیقی زبان کے ساتھ سادگی بیان اور تفکر کی گہرائی سبھی کچھ ملتا ہے۔ قراۃ العین منظر کشی میں ید طولی رکھتی ہیں۔ ان کی مہارت اس ناول میں پوری آب و تاب سے دکھائی دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے تخیل کی مدد سے وہ ہر چیز کو سامنے لے آتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں قاری اس چیز کو تمام تر رنگینیوں اور تفصیلات کے ساتھ اپنی آنکھوں کے سامنے پاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس دیکھیے:

> "اس وقت جاڑوں کی سہانی دھوپ ساری زندگی پر بکھری ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ ایڈم گرلز کالج کی بلند عمارت پڑھائی کی سنجیدہ و خاموشی میں ڈوب گئیں جس طرح جہاز آہستہ آہستہ گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے ان عمارتوں کے روشن کمروں میں دیوار پر لگی برطانیہ کے شاہی خاندان اور بنگال کے شاہی گورنرں کی منجمند آنکھیں چپ چاپ سامنے کے منظر کو دیکھتی رہیں جہاں بھانت بھانت کے سماجی و اقتصادی پس منظر سے آئی ہوئی قدیم بنگال کی نئی بیٹیاں اپنی اپنی کتابوں پر جھکی حصول علم میں منہمک تھیں اور کون کہہ سکتا تھا کہ باہر بے کراں فضا پرانی جنگوں کی جھنکار سے گونج رہی ہیں۔ ان جنگوں میں لڑنے والے جو زبانیں بولتے تھے وہ بھلا دی گئیں۔ وہ قومیں اور نسلیں ختم ہو چکیں جن وجوہات اور مقاصد کے لیے وہ جنگیں لڑی گئیں وہ فراموش کر دیے گئے۔ (۷)

اس ایک اقتباس میں ہمیں قراۃ العین کی بے مثال منظر کشی اور خوبصورت نثر جس میں تخلیقی انداز بھی ہے اور فکر آمیزش بھی سب کچھ مل جاتا ہے اسی سے ہمیں ان کے اسلوب کی پختگی کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ آخر شب کے ہم سفر فنی اعتبار سے ان کے پہلے لکھے گئے تین ناولوں میں سب سے بہتر ہے۔ اس میں حقیقت پسندی اور فنی پختگی زیادہ ہے۔ ڈاکٹر سید جاوید اختر لکھتے ہیں:

> " قوت بیان کی قرۃ العین حیدر میں کبھی کمی نہیں رہی افسانہ ہو یا ناول ان کا قلم عجب انداز سے موتی پرونے میں مشتاق رہتا ہے لیکن جب ان کے قلم نے ہر قسم کی سیاسی، مذہبی اور سماجی طرفاریوں کی حدود سے نکل کر لکھنا شروع کیا تو آخر شب کے ہم سفر کی تخلیق ممکن

> ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول میرے بھی صنم خانے، سفینہ غم دل اور آگ کا دریا سے بہتر ہے۔"(۸)

قراۃ العین حیدر نے اُردو میں اسلوب اور اظہار کی نئی راہیں متعارف کرائیں۔ اُردو ناول کے ریگستان میں قراۃ العین حیدر کے ناول ایک سرسبز و شاداب نخلستان کی طرح ہیں۔ مگر ان میں پائی جانے والی فلسفانہ گہرائی و گیرائی قاری کے لیے کبھی کبھی مبہم ہو جاتی ہے۔ شاید قرۃ العین کے ناول بھی غالب کی شاعری کی طرح ہیں، اپنے دور سے آگے کی چیز ہیں اور رنگ غالب کی طرح آنے والے زمانوں میں بھی انہیں ہمیشہ وہ مقبولیت اور مقام و مرتبہ ملے گا جس کی وہ حقدار ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اُردو ناول، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء) ص ۱۷۴
۲۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی اہلِ قلم خواتین ایک ادبی جائزہ، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۳ء)ص ۲۴۴
۳۔ نیلم فرزانہ، اُردو ادب کی خواتین ناول نگار، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۴۴
۴۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول، (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان ۱۹۹۷ء)، ص ۱۳۴
۵۔ قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۷
۶۔ ایضاً، ص ۱۲۹
۷۔ ایضاً، ص ۱۵
۸۔ سید جاوید اختر، ڈاکٹر اُردو کی ناول نگار خواتین (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۷ء)، ص ۱۳۲